بعد از ۱۸۴۷ء

۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۲ء

مُتفرّق

نسخۂ لاہور

۱۸۵۲ء

○ ...بعد از[1] ۱۸۴۷ء

قطعہ

م

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر — اے جہاندارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل
پالو سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ — فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل
تیرا اندازِ سخن، شانۂ زلفِ الہام — تیری رفتارِ قلم، جنبشِ بالِ جبریل
تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم — تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل
بہ سخن، اوج دہِ مرتبۂ معنی و لفظ — بہ کرم، داغ نہِ ناصیۂ قلزم و نیل
تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر — تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل
ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر — زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل
تیری دانش، مری اصلاحِ مفاسد کی رہین — تیری بخشش، مرے ایجادِ مقاصد کی کفیل
تیرا اقبالِ ترحّم، مرے جینے کی نوید — تیرا اندازِ تغافل، مرے مرنے کی دلیل

---

[1] عرشی صاحب (دیوانِ غالب طبع دوم مرتبہ عرشی ص ۱۳۲) لکھتے ہیں کہ غالب کی زندگی میں چھپے ہوئے دیوانِ غالب کے دوسرے ایڈیشن، مملوکہ رضا لائبریری رامپور، کے آخری سادہ اوراق پر میرزا صاحب کا وہ کلام نقل کیا گیا ہے جو انھوں نے اس دیوان کی اشاعت کے بعد کہا تھا۔ اتفاق سے میرے غالب کلکشن میں بھی، غالب کی زندگی میں چھپے ہوئے دوسرے ایڈیشن کا نسخہ موجود ہے اور اس کے آخر میں بھی تقریباً وہی تمام کلام کسی نامعلوم شخص کے قلم سے درج ہے جس کی نشاندہی عرشی صاحب نے کی ہے بلکہ میرے نسخے میں کچھ کلام زائد ہے میں نے اسے بھی شامل کر لیا ہے۔ ایسے کلام کو ۱۸۴۷ء کے بعد چند ہی سالوں کے دوران میں کا کہا ہوا کہنا چاہیے۔ اس نسخے میں جو کلام "بعد از ۱۸۴۷ء" کے عنوان سے درج ہے وہ یہی کلام ہے۔

○ ... بعد از ۱۸۴۷ء

بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں ق چرخِ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل
پیچھے ڈالی ہے، سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ پہلے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل
تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِ ثقیل
دُرِ معنی سے، مرا صفحۂ لقا کی داڑھی غمِ گیتی سے، مرا سینہ، عمر کی زنبیل
فکر میری، گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر کِلک میری، رقم آموزِ عباراتِ قلیل
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق، توضیح میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل
نیک ہوتی مری حالت، تو نہ دیتا تکلیف جمع ہوتی مری خاطر، تو نہ کرتا تعجیل

قبلۂ کون و مکاں، خستہ نوازی میں یہ دیر؟
کعبۂ امن و اماں، عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل؟

غزلیات

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں! م گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا؟
ہے ایک تیر، جس میں دونوں چھِدے پڑے ہیں م وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا
درماندگی میں، غالبؔ، کچھ بن پڑے، تو جانوں م جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

گھر ہمارا، جو نہ روتے بھی تو، ویراں ہوتا م بحر گر بحر نہ ہوتا، تو بیاباں ہوتا
تنگیِ دل کا گلہ کیا؟ یہ وہ کافر دل ہے م کہ اگر تنگ نہ ہوتا، تو پریشاں ہوتا

○ ... بعد از ۱۸۴۷ء

بعدِ یک عمر ورع، بار تو دیتا، بارے م کاش! رضواں ہی درِ یار کا دربان ہوتا

ہوئی تاخیر، تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا م آپ آتے تھے، مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
تم سے بے جا ہے، مجھے اپنی تباہی کا گلہ م اُس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا
تو مجھے بھول گیا ہو، تو پتا بتلا دوں م کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا؟
قید میں ہے ترے وحشی کو، وہی زلف کی یاد م ہاں کچھ اک رنجِ گراں باریِ زنجیر بھی تھا
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے، تو کیا؟ م بات کرتے، کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا
یوسف اُس کو کہوں، اور کچھ نہ کہے، خیر ہوئی م گر بگڑ بیٹھے، تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا
دیکھ کر غیر کو، ہو کیوں نہ کلیجا ٹھنڈا؟ م نالہ کرتا تھا، و لے طالبِ تاثیر بھی تھا
پیشے میں عیب نہیں، رکھیے نہ فرہاد کو نام م ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا
ہم تھے مرنے کو کھڑے، پاس نہ آیا، نہ سہی م آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق م آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟
ریختے کے تمھیں اُستاد نہیں ہو، غالبؔ م کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا م اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پر جیے ہم، تو یہ جان، جھوٹ جانا م کہ خوشی سے مر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا
تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا م کبھی تو نہ توڑ سکتا، اگر اُستوار ہوتا

○ ...بعد از ۱۸۴۷ء

کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیرِ نیم کش کو م یہ خلش کہاں سے ہوتی، جو جگر کے پار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح؟ م کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا
رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا م جسے غم سمجھ رہے ہو، یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے م غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے؟ شبِ غم بُری بلا ہے م مجھے کیا بُرا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رُسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا م نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا
اُسے کون دیکھ سکتا، کہ یگانہ ہے وہ یکتا م جو دوئی کی بو بھی ہوتی، تو کہیں دوچار ہوتا
یہ مسائلِ تصوّف، یہ ترا بیان، غالبؔ! م تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

نہ تھا کچھ، تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا، تو خدا ہوتا م ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں، تو کیا ہوتا؟
ہوا جب غم سے یوں بے حس، تو غم کیا سر کے کٹنے کا؟ م نہ ہوتا گر جدا تن سے، تو زانو پر دھرا ہوتا
ہوئی مدّت کہ غالبؔ مر گیا، پر یاد آتا ہے م وہ ہر یک بات پر کہنا کہ "یوں ہوتا، تو کیا ہوتا"

گھر جب بنا لیا ترے در پر، کہے بغیر م جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر، کہے بغیر؟
کہتے ہیں، جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن م جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر، کہے بغیر؟
کام اُس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں م لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر
جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے، وگرنہ ہم م سر جائے یا رہے، نہ رہیں پر کہے بغیر

○ ...بعد از ۱۸۴۷ء

چھوڑوں گا میں نہ اُس بُتِ کافر کا پوجنا م چھوڑے نہ خلق، گو، مجھے کافر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ، ولے گفتگو میں کام م چلتا نہیں ہے، دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو م بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
بہرا ہوں میں، تو چاہیے دُونا ہو التفات م سنتا نہیں ہوں بات، مکرّر کہے بغیر
غالبؔ، نہ کر حضور میں تو بار بار عرض م ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر، کہے بغیر

تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو م مجھ کو بھی پوچھتے رہو، تو کیا گناہ ہو
بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے م قاتل اگر رقیب ہے، تو تم گواہ ہو
کیا وہ بھی بے گنہ کش و حق ناسپاس ہیں؟ م مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو
اُبھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار م مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
جب میکدہ چھُٹا، تو پھر اب کیا جگہ کی قید م مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو
سُنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست م لیکن خدا کرے، وہ ترا جلوہ گاہ ہو
غالبؔ بھی گر نہ ہو، تو کچھ ایسا ضرر نہیں م دنیا ہو، یا رب، اور مرا بادشاہ ہو

تسکیں کو ہم نہ روئیں، جو ذوقِ نظر ملے م حورانِ خلد میں تری صورت، مگر ملے
اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن، بعدِ قتل م میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے؟
ساقی گری کی شرم کرو آج، ورنہ ہم م ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

○ ... بعد از ۱۸۴۷ء

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں، لیکن اے ندیم م میرا سلام کہیو، اگر نامہ بر ملے
تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا م فرصت، کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے
لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں م جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے
اے ساکنانِ کوچۂ دلدار، دیکھنا م تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

کوئی دن گر زندگانی اور ہے م اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں؟ م سوزِ غمہائے نہانی اور ہے
بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں م پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے
دے کے خط، منہ دیکھتا ہے نامہ بر م کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے
قاطعِ اعمار ہیں، اکثر نجوم م وہ بلائے آسمانی اور ہے
ہو چکیں، غالبؔ، بلائیں سب تمام م ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

کوئی اُمید بر نہیں آتی م کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معیّن ہے م نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی م اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد م پر طبیعت اِدھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں م ورنہ، کیا بات کر نہیں آتی

○ ... بعد از ۱۸۴۷ء

کیوں نہ چیخوں؟ کہ یاد کرتے ہیں م میری آواز، گر نہیں آتی
داغِ دل گر نظر نہیں آتا م بو بھی، اے چارہ گر! نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی م کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی م موت آتی ہے، پر نہیں آتی
کعبے کس منہ سے جاؤ گے، غالبؔ؟ م شرم تم کو مگر نہیں آتی

دلِ ناداں، تجھے ہوا کیا ہے؟ م آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟
ہم ہیں مشتاق، اور وہ بیزار م یا الٰہی، یہ ماجرا کیا ہے؟
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں م کاش! پوچھو کہ "مدّعا کیا ہے"

ق

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود م پھر یہ ہنگامہ، اے خدا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ م غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟ م نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ م ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید م جو نہیں جانتے، وفا کیا ہے؟
"ہاں، بھلا کر، ترا بھلا ہوگا!" م اور درویش کی صدا کیا ہے؟

○ ... بعداز ۱۸۴۷ء

جان تم پر نثار کرتا ہوں ۔ م ۔ میں نہیں جانتا، دُعا کیا ہے؟
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ ۔ م ۔ مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے؟

حُسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال، اچھا ہے ۔ م ۔ اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے
بوسہ دیتے نہیں، اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ ۔ م ۔ جی میں کہتے ہیں کہ "مفت آئے تو مال اچھا ہے"
اور بازار سے لے آئے، اگر ٹوٹ گیا ۔ م ۔ ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال، اچھا ہے
بے طلب دیں، تو مزا اس میں سوا ملتا ہے ۔ م ۔ وہ گدا، جس کو نہ ہو خوئے سوال، اچھا ہے
اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے مُنہ پر رونق ۔ م ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
دیکھیے، پاتے ہیں عُشّاق بتوں سے کیا فیض ۔ م ۔ اک برہمن نے کہا ہے کہ "یہ سال اچھا ہے"
ہم سخن، تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا ۔ م ۔ جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال، اچھا ہے!
قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے ۔ م ۔ کام اچھا ہے وہ، جس کا کہ مآل اچھا ہے
خضر[1] سلطاں کو رکھے، خالقِ اکبر سرسبز ۔ م ۔ شاہ کے باغ میں، یہ تازہ نہال اچھا ہے

---

[1] بہادر شاہ ظفرؔ کے ۱۶ بیٹوں میں سے آٹھویں بیٹے اور غالبؔ کے شاگرد۔ ۲۲ ستمبر ۱۸۵۷ء کو میجر ہڈسن کی گولی کا نشانہ بنے (بہادر شاہ ظفرؔ۔ از اسلم پرویز ص ۱۷۵)۔ وفات کے وقت عمر ۲۶ سال سے متجاوز نہیں تھی۔ (تلامذۂ غالبؔ طبعِ دوم ص ۱۷۴)۔ اس طرح سالِ ولادت ۱۸۳۱ء ہوا۔
جناب مالک رام نے لکھا ہے کہ "خالقِ اکبر" سے یہاں اس شعر میں اکبر شاہ ثانی کی طرف اشارہ ہے جو خضر سلطان کے دادا تھے۔ اور جو ۱۸۰۶ء سے ۱۸۳۷ء تک حکمران رہے۔ میری رائے میں اس کا مطلب بیش از بیش یہ نکل سکتا ہے کہ کبھی یہ شعر غالبؔ نے ۱۸۳۱ء میں شہزادہ خضر سلطان کی ولادت (تازہ نہال) پر کہہ کر حافظے میں رکھا ہوگا۔ جب برسوں (۱۸۴۷ء کے) بعد اس زمین میں غزل کہی تو اسی میں اس شعر کو بھی شامل کر دیا۔

○ ... بعداز ۱۸۴۷ء

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت، لیکن ۔ م ۔ دل کے خوش رکھنے کو، غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

شکوے کے نام سے، بے مہر، خفا ہوتا ہے ۔ م
یہ بھی مت کہہ، کہ جو کہیے، تو گِلا ہوتا ہے
پُر ہوں میں، شکوے سے یوں، راگ سے جیسے باجا ۔ م
اک ذرا چھیڑیے، پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے
گو سمجھتا نہیں پر حُسنِ تلافی دیکھو ۔ م
شکوۂ جَور سے، سرگرمِ جفا ہوتا ہے
عشق کی راہ میں، ہے چرخِ مُکوکب کی وہ چال ۔ م
سُست رَو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے
کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد؟ کہ ہم ۔ م
آپ اُٹھا لاتے ہیں، گر تیر خطا ہوتا ہے
خوب تھا، پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ ۔ م
کہ بھلا چاہتے ہیں، اور بُرا ہوتا ہے
نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا، اور اب ۔ م
لب تک آتا ہے، جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

○ ... بعد از ۱۸۴۷ء

ق

خامہ میرا کہ وہ ہے باربدِ بزمِ سخن م

شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

اے شہنشاہِ کواکب سپہ مہرِ علَم ! م

تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے م

تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے

ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال م

آستاں پر ترے، مہ ناصیہ سا ہوتا ہے

میں جو گستاخ ہوں، آئینِ غزل خوانی میں م

یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

رکھیو غالب، مجھے اس تلخ نوائی میں مُعاف م

آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تو کیا ہے؟" م تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

نہ شعلے میں یہ کرشمہ، نہ برق میں یہ ادا م کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے؟

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے م وگرنہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہے؟

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے، پیراہن م ہمارے جَیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے؟

○ ... بعد از ۱۸۴۷ء

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا م کریدتے ہو جو اب راکھ، جستجو کیا ہے؟

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل م جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا، تو پھر لہو کیا ہے؟

وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز م سوائے بادۂ گلفامِ مُشک بو کیا ہے؟

پیوں شراب، اگر خُم بھی دیکھ لوں دو چار م یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبُو کیا ہے؟

رہی نہ طاقتِ گفتار، اور اگر ہو بھی م تو کس اُمید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے؟

ہوا ہے شہ کا مُصاحب، پھرے ہے اتراتا م وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے؟

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی م میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

شرع و آئین پر مدار سہی م ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

چال جیسے کڑی کمان کا تیر م دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

بات پر واں زبان کٹتی ہے م وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ م کچھ نہ سمجھے، خُدا کرے کوئی

نہ سنو، گر بُرا کہے کوئی م نہ کہو، گر بُرا کرے کوئی

روک لو، گر غلط چلے کوئی م بخش دو، گر خطا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند؟ م کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے! م اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اُٹھ گئی، غالب م کیوں کسی کا گلا کرے کوئی

○ ... بعد از ۱۸۴۷ء

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے م بیٹھا رہا، اگرچہ اشارے ہوا کیے
دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا م میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے؟
رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجّادہ رہن مے م مدّت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے
بے صرفہ ہی گزرتی ہے، ہو گرچہ عمر خضر م حضرت بھی کل کہیں گے کہ "ہم کیا کیا کیے"
مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ "اے لئیم م تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے؟"
کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو؟ م کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے
صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو م دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے
ضد کی ہے اور بات، مگر خو بری نہیں م بھولے سے اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے
غالبؔ، تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا م مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سُنا کیے

میں اُنہیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں م چل نکلتے، جو مے پیے ہوتے
قہر ہو یا بلا ہو، جو کچھ ہو م کاشکے! تم مرے لیے ہوتے
میری قسمت میں غم، گر اتنا تھا م دل بھی یارب، کئی دیے ہوتے
آ ہی جاتا وہ راہ پر، غالبؔ! م کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

... ۲۲ [۲۱] فروری ۱۸۴۸ء[1]

ذکر اُس پری وش کا، اور پھر بیاں اپنا م بن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے "تلاش غالب" از ڈاکٹر نثار احمد فاروقی ص ۱۳۳، مضمون "حادثۂ اسیری اور غالب (ایک غزل کا زمانۂ تصنیف)"۔

○ ... ۲۲ [۲۱] فروری ۱۸۴۸ء

مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں، یارب م آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا
منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے م عرش سے اِدھر ہوتا کاشکے! مکاں اپنا
دے وہ جس قدر ذلّت ہم ہنسی میں ٹالیں گے م بارے، آشنا نکلا، اُن کا پاسباں، اپنا
درد دل لکھوں کب تک؟ جاؤں اُن کو دکھلا دوں م انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا
گھستے گھستے مٹ جاتا، آپ نے عبث بدلا م ننگِ سجدہ سے میرے، سنگِ آستاں اپنا
تاکرے نہ غمّازی، کر لیا ہے دشمن کو م دوست کی شکایت میں ہم نے ہم زباں اپنا
ہم کہاں کے دانا تھے؟ کس ہنر میں یکتا تھے؟ م بے سبب ہوا، غالبؔ! دشمن آسماں اپنا

○ ... ۱۸۴۹ء

قطعہ

مژدہ! اے رہروانِ راہِ سخن م پایہ سنجانِ دست گاہِ سخن[1]
طے کرو راہِ شوق زود زود م آن پہنچی ہے منزلِ مقصود!
پاس ہے اب، سوادِ اعظمِ نثر م دیکھیے، چل کے، نظمِ عالمِ نثر
سب کو اُس کا سواد ارزانی! م چشمِ بینش ہو جس سے نورانی
یہ تو دیکھو کہ کیا نظر آیا م جلوۂ مُدّعا نظر آیا
ہاں، یہی شاہراہِ دہلی ہے م مطبعِ بادشاہِ دہلی ہے
منطبع ہو رہی ہے پنج آہنگ م گل و ریحان و لالہ رنگا رنگ

[1] منظوم اشتہار "اسعد الاخبار" آگرہ ۔ ۱۲ مارچ ۱۸۴۹ء۔ یہ اشتہار غالب کے شاگرد غلام نجف خاں کے نام سے چھپا تھا۔

○ ...۱۸۴۹ء

ہے یہ وہ گلشنِ ہمیشہ بہار — بارور جس کا سرو، گل بے خار
نہیں اس کا جواب، عالم میں — نہیں ایسی کتاب، عالم میں
اس سے اندازِ شوکتِ تحریر — اخذ کرتا ہے آسماں کا دبیر
مرحبا! طرزِ نغز گفتاری — حبّذا! رسم و راہِ نثّاری
نثر مدحت سرا ہے ابراہیم — ہے مُقرّر جو، اب، پئے تعلیم
اُس کے فقروں میں کون آتا ہے؟ — کیا کہیں، کیا وہ راگ گاتا ہے
تین نثروں سے کام کیا نکلے؟ — اُن کے پڑھنے سے نام کیا نکلے؟
ورزشِ قصّۂ کہن کب تک؟ — داستانِ شہِ دکن کب تک؟
تا کجا درسِ نثر ہا ہے کہن؟ — تازہ کرتا ہے دل کو، تازہ سخن
تھے ظہوری و عرفی و طالب — اپنے اپنے زمانے میں غالب
نہ ظہوری ہے اور نہ طالب ہے — اسد اللہ خانِ غالب ہے
قول حافظ کا ہے بجا، اے دوست — "ہر کرا پنج روز نوبت اوست"
کل وہ سرگرمِ خود نمائی تھے — شمعِ بزمِ سخن سرائی تھے
آج یہ قدر دانِ معنی ہے — بادشاہِ جہانِ معنی ہے
نثر اس کی، ہے کارنامۂ راز — نظم اس کی، نگارنامۂ راز
دیکھو اس دفترِ معانی کو — سیکھو آئینِ نکتہ دانی کو
اس سے جو کوئی بہرہ ور ہوگا — سینہ گنجینۂ گہر ہوگا

○ ...۱۸۴۹ء

ہو سخن کی جسے طلب گاری — کرے اس نسخے کی خریداری
آج جو دیدہ در کرے درخواست — تین بھیجے پُرَے، وہ بے کم و کاست
منطبع جب کہ ہو چکے گی کتاب — زرِ قیمت کا ہوگا اور حساب
چار سے، پھر نہ ہوگی کم قیمت — اس سے لیویں گے، کم، نہ ہم، قیمت
جس کو منظور ہو کہ زر بھیجے — احسن اللہ خاں کے گھر بھیجے
وہ بہارِ ریاضِ مہر و وفا — جس کو کہتے ہیں عمدۃ الحکما
میں جو ہوں درپئے حصولِ شرف — نام عاصی کا ہے غلام نجف
ہے یہ، القصّہ، حاصلِ تحریر — کہ نہ ارسالِ زر میں ہو تاخیر

چشمۂ انطباع جاری ہے
ابتدائے ورق شماری ہے

غزلیات

○ ...۱۸۴۹ء (آخر ما)

حیراں ہوں، دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں م — مقدور ہو تو، ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں م — ہر یک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں
جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار م — اے کاش! جانتا نہ ترے رہ گزر کو میں
ہے کیا جو کس کے باندھیے؟ میری بلا ڈرے م — کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں؟
لو، وہ بھی کہتے ہیں کہ "یہ بے ننگ و نام ہے" م — یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

○ ... ۱۸۴۹ء (آخرِ ما)

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رَو کے ساتھ م پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں
خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار م کیا پوجتا ہوں اُس بُتِ بیداد گر کو میں؟
پھر بے خودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار م جاتا، وگرنہ، ایک دن اپنی خبر کو میں
اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا م سمجھا ہوں دل پذیر متاعِ ہنر کو میں
غالبؔ، خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز م دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں[1]

... ۱۸۵۰ء (آخرِ ما)

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں م خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں
کیوں گردشِ مُدام سے گھبرا نہ جائے دل؟ م انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب، زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟ م لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں
حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے م آخر گناہ گار ہوں، کافر نہیں ہوں میں
کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے؟ م لعل و زمُرّد و زر و گوہر نہیں ہوں میں
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ؟ م رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھ کو منعِ قدم بوس کس لیے؟ م کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں؟
غالبؔ، وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا م وہ دن گئے کہ کہتے تھے "نوکر نہیں ہوں میں"[2]

لے نواب علی بہادر، والیِ باندہ، اگست ۱۸۴۹ء میں حاکم باندہ ہوئے۔ وفات ۱۸۷۳ء
لے غالبؔ ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو بادشاہ کے باقاعدہ ملازم ہوئے تھے

○ ... ۱۸۵۰ء

رباعیات[1]

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں وہ مجھ کو رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو جو کہ ہووے صوفی؟
شیعی کیوں کر ہو، ماورَاالنّہری؟

اصحاب کو جو کہ ناسزا کہتے ہیں
سمجھیں تو ذرا دل میں کہ کیا کہتے ہیں
سمجھا تھا نبیؐ نے ان کو اپنا ہمدم
ہے ہے! نہ کہو کسے بُرا کہتے ہیں

یارانِ رسولؐ، یعنی اصحابِ کبار
ہیں گرچہ بہت، خلیفہ اُن میں ہیں چار
ان چار میں ایک سے ہو جس کو انکار
غالبؔ، وہ مسلمان نہیں ہے زنہار

یارانِ نبیؐ میں تھی لڑائی کس میں؟
الفت کی نہ تھی جلوہ نمائی کس میں؟
وہ صدق، وہ عدل، وہ حیا اور وہ علم
بتلاؤ کوئی کہ تھی برائی کس میں؟

یارانِ نبیؐ سے رکھ تولّا، باللہ!
ہر یک ہے کمالِ دیں میں یکتا باللہ!
وہ دوست نبیؐ کے اور تم ان کے دشمن
لَاحَولَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّابِاللہ!

لے یہ پانچوں رباعیاں سید الاخبار دہلی، جلد ۸ شمارہ ۲۸ - ۱۶ / نومبر ۱۸۵۰ء میں شائع ہوئی تھیں

○ ... ۱۸۵۱ء

غزلیات

منظور تھی یہ شکل تجلّی کو، نور کی م قسمت کھلی، ترے قد و رخ سے، ظہور کی
اک خوں چکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں م پڑتی ہے آنکھ، تیرے شہیدوں پہ، حور کی
واعظ، نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو م کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی
لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل، کہ کیوں اُٹھا؟ م گویا، ابھی سُنی نہیں آواز صُور کی
آمد بہار کی ہے، جو بلبل ہے نغمہ سنج م اُڑتی سی اک خبر ہے، زبانی طیور کی
گو واں نہیں، پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں م کعبے سے، اُن بتوں کو بھی، نسبت ہے دُور کی
کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب؟ م آؤ نہ، ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی
گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اِس قدر م کی جس سے بات، اُس نے شکایت ضرور کی
غالبؔ اگر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں م حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی[1]

---

[1] بادشاہ کی اپنی صحت بھی خراب تھی چنانچہ "دسمبر ۱۸۵۱ء میں ریذیڈنٹ دہلی نے رپورٹ بھیجی کہ بادشاہ بیمار اور زندگی سے بیزار ہے، اور حج کے لیے مکّہ معظّمہ جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ غالبًا غالبؔ نے اسی موقعہ پر کہا تھا ؎

غالبؔ گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی"

(آثارِ غالبؔ از شیخ محمد اکرام ص ۹۸)

غزل کی فکر کا زمانہ بھی آخرِ ۱۸۵۱ء ہی ہونا چاہیے

○ ... ۱۸۵۱ء

کہتے تو ہو تم سب کہ بُتِ غالیہ مو آئے م یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ "وہ آئے"[1]
ہُوں کشمکشِ نزع میں، ہاں جذبِ محبّت م کچھ کہہ نہ سکوں، پر وہ مرے پوچھنے کو آئے
ہے[2] زلزلہ و صرصر و سیلاب کا عالم م آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں، گو آئے
ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین م ہاں مُنہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے
جلّاد سے ڈرتے ہیں، نہ واعظ سے جھگڑتے م ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے
ہاں اہلِ طلب، کون سنے طعنۂ نایافت؟ م دیکھا کہ وہ ملتا نہیں، اپنے ہی کو کھو آئے
اپنا وہ نہیں شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں م اُس دَر پہ نہیں بار، تو کعبے ہی کو ہو آئے
کی ہم نفَسوں نے اثرِ گریہ میں، تقریر م اچھے رہے آپ اُس سے، مگر مجھ کو ڈبو آئے
اس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے، غالبؔ! م ہم بھی گئے واں، اور تری تقدیر کو رو آئے

قصیدہ[3]

... ۱۸۵۲ء (قج)

م

ہاں، مہِ نو، سُنیں ہم اُس کا نام جس کو تو، جُھک کے، کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح یہی انداز اور یہی اندام
بارے، دو دن کہاں رہا غائب؟ بندہ عاجز ہے، گردشِ ایّام

---

[1] نادراتِ غالبؔ ص ۱۲ اور دہلی اردو اخبار، جلد ۱۳ نمبر ۱۹، ص ۴، مورخہ ۱۱ رمئی ۱۸۵۱ء
[2] مج میں ہے "ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم" ہے مگر انتخابِ غالب (رخ) مکتوبہ ۱۸۶۶ء میں غالبؔ نے اسے اوپر کے مصرعے سے بدل دیا تھا
[3] قج = "در مدح شہنشاہ جم جاہ سلیمان بارگاہ سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی"

○ ...۱۸۵۲ء (تج)

اُڑ کے جاتا کہاں؟ کہ تاروں کا   آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا! اے سرورِ خاصِ خواص   حبذا! اے نشاطِ عامِ عوام
عذر میں، تین دن نہ آنے کے   لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا   صبح جو جائے اور آئے شام
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا   تیرا آغاز اور ترا انجام
رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے؟   مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام؟
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں   ایک ہی ہے امید گاہِ انام
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش   غالب اُس کا، مگر نہیں ہے، غلام؟
جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو   تب کہا ہے بہ طرزِ استفہام
مہرِ تاباں کو ہو تو ہو، اے ماہ   قربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام

ق

تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا؟   جز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام
جانتا ہوں کہ اُس کے فیض سے تو   پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام
ماہ بن، ماہتاب بن، میں کون؟   مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام
میرا اپنا جُدا معاملہ ہے   اور کے لین دین سے کیا کام
ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص   گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام
جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِّ فروغ   کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام؟

○ ...۱۸۵۲ء (تج)

جب کہ چودہ منازلِ فلکی   کر چکے قطع، تیری، تیزیِ گام
تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر   کوے و مشکوے و صحن و منظر و بام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز   اپنی صورت کا، اک بلوریں جام
پھر غزل کی روش پہ چل نکلا   توسنِ طبع چاہتا تھا لگام
زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام   غزل تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام
مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں؟   غم سے جب ہو گئی ہو، زیست، حرام
بوسہ کیسا؟ یہی غنیمت ہے   کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام
کعبے میں جا، بجائیں گے ناقوس   اب تو باندھا ہے دیر میں احرام
اُس قدح کا، ہے، دور مجھ کو نقد   چرخ نے لی ہے، جس سے گردشِ وام
بوسہ دینے میں اُن کو ہے انکار   دل کے لینے میں جن کو تھا ابرام
چھیڑتا ہوں کہ، اُن کو غصہ آئے   کیوں رکھوں، ورنہ، غالب اپنا نام؟
کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ   اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام!
کون ہے؟ جس کے در پہ ناصیہ سا   ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا، تو مجھ سے سن   نامِ شاہنشہِ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل، بہادر شاہ   مظہرِ ذوالجلال والاکرام
شہسوارِ طریقۂ انصاف   نو بہارِ حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز   جس کا ہر قول، معنیِ الہام

بزم میں، میزبانِ قیصر و جم
رزم میں، اوستادِ رستم و سام

اے ترا لطف، زندگی افزا!
اے ترا عہد، فرخی فرجام

چشمِ بد دور! خسروانہ شکوہ
لوحش اللہ! عارفانہ کلام

جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم
جرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام

وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے
ایرج و تور و خسرو و بہرام

زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے
گیو و گودرز و بیژن و رہام

مرحبا موشگافیِ ناوک!
آفریں آب داریِ صمصام!

تیر کو تیرے، تیرِ غیر، ہدف
تیغ کو تیری، تیغِ خصم، نیام

ق

رعد کا، کر رہی ہے کیا، دم بند!
برق کو دے رہا ہے کیا الزام

تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا
تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام

ق

فنِ صورت گری میں، تیرا گرز
گر نہ رکھتا ہو دست گاہِ تمام

اُس کے مضروب کے سر و تن سے
کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام؟

جب ازل میں رقم پذیر ہوئے
صفحہ ہائے لیالی و ایام

اور ان اوراق میں بہ کلکِ قضا
مجملاً مندرج ہوئے احکام

لکھ دیا شاہدوں کو "عاشق کش"
لکھ دیا عاشقوں کو "دشمن کام"

آسماں کو، کہا گیا کہ کہیں
"گنبدِ تیز گردِ نیلی فام"

حکمِ ناطق لکھا گیا کہ لکھیں
خال کو "دانہ" اور زلف کو "دام"

آتش و آب و باد و خاک نے لی
وضعِ سوز و نم و رم و آرام

مہرِ رخشاں کا نام "خسروِ روز"
ماہِ تاباں کا اسم "شحنۂ شام"

تیری توقیعِ سلطنت کو بھی
دی بدستور، صورتِ ارقام

کاتبِ حکم نے، بموجبِ حکم
اُس رقم کو دیا طرازِ دوام

ہے ازل سے روائیِ آغاز
ہو ابد تک رسائیِ انجام

قصیدہ

م

صبح دم، دروازۂ خاور کھلا
مہرِ عالمتاب کا منظر کھلا

خسروِ انجم کے، آیا صرف میں
شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا

وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود
صبح کو، رازِ مہ و اختر کھلا

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا، یہ بازی گر کھلا

سطحِ گردوں پر پڑا تھا، رات کو
موتیوں کا، ہر طرف، زیور کھلا

صبح آیا، جانبِ مشرق، نظر
اک نگارِ آتشیں رخ، سر کھلا

تھی نظر بندی، کیا جب ردِّ سحر
بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا

○ ...۱۸۵۲ء (قچ)

لاکے، ساقی نے صبوحی کے لیے — رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا
بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ — کعبۂ امن و اماں کا در کھلا
تاجِ زرّیں، مہرِ تاباں سے سوا — خسروِ آفاق کے منہ پر کھلا
شاہِ روشن دل، بہادر شہ کو ہے — رازِ ہستی اُس پہ سرتا سر کھلا
وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں — مقصدِ نہ چرخ و ہفت اختر کھلا
وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے — عُقدۂ احکامِ پیغمبر کھلا
پہلے واؤ کا، نکل آیا ہے نام — اُس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا
رُوشناسوں کی جہاں فہرست ہے — واں لکھا ہے، چہرۂ قیصر کھلا

ق

توسنِ شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب — تھان سے وہ عبرتِ صرصر کھلا
نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب — تو کہے، بُت خانۂ آزر کھلا
مجھ پہ، فیضِ تربیت سے شاہ کے — منصبِ مہر و مہ و محور کھلا
لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک — میری حدِّ وُسع سے باہر کھلا
تھا، دلِ وابستہ، قفلِ بے کلید — کس نے کھولا؟ کب کھلا؟ کیونکر کھلا؟
باغِ معنی کی، دکھاؤں گا بہار — مجھ سے، گر، شاہِ سخن گستر کھلا
ہو جہاں گرمِ غزالخوانی، نفس — لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

○ ... ۱۸۵۲ء (قچ)

غزل

کُنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا — کاش کے! ہوتا قفس کا در کھلا
ہم پکاریں اور کھلے، یوں کون چاہے؟ — یار کا دروازہ پاویں، گر، کھلا
ہم کو اُس رازداری پر گھمنڈ — دوست کا، ہے رازِ دشمن پر کھلا
واقعی، دل پر بھلا لگتا تھا داغ — زخم، لیکن، داغ سے بہتر کھلا
ہاتھ سے رکھ دی، کب ابرو نے کماں؟ — کب کمر سے غمزے کی خنجر کھلا
مفت کا، کس کو بُرا ہے، بدرقہ — رہروی میں، پردۂ رہبر کھلا
سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک؟ — آگ بھڑکی، منہ اگر دم بھر کھلا
نامے کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ — رہ گیا، خط میری چھاتی پر، کھلا
دیکھیو، غالبؔ سے گر اُلجھا کوئی — ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

پھر، ہوا مدحت طرازی کا خیال — پھر، مہ و خورشید کا دفتر کھلا
خامے سے پائی، طبیعت نے، مدد — بادباں بھی، اٹھتے ہی لنگر، کھلا
مدح سے، ممدوح کی دیکھی شکوہ — یاں، عَرَض سے، رتبۂ جوہر کھلا
مہر کانپا، چرخ چکّر کھا گیا — بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا
بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب — اب، عُلوِّ پایۂ منبر کھلا
سکّۂ شہ کا، ہوا ہے روشناس — اب، عیارِ آبروئے زر کھلا

○ ۱۸۵۲ء ... (قحط)

شاہ کے آگے دھرا ہے آئنہ — اب، مآلِ سعیِ اسکندر کھلا
ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے — اب، فریبِ طغرل و سنجر کھلا
ہو سکے کیا مدح؟ ہاں، اک نام ہے — دفترِ مدحِ جہاں داور کھلا
فکر اچھی، پر ستایش ناتمام — عجزِ اعجازِ ستایش گر کھلا
جانتا ہوں، ہے خطِ لوحِ ازل — تم پہ، اے خاقانِ نام آور، کھلا
تم کرو صاحب قرانی، جب تلک — ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

سہرا

۱۸۵۲ء ...

خوش ہو، اے بخت، کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ، شہزادہ جواں بخت کے سر پر، سہرا
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے!
ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا
سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے، پر اے طرفِ کلاہ!
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر، سہرا

لے مرزا جواں بخت کی "شادی کی تاریخیں یکم و دوم ماہ اپریل ۱۸۵۲ء بتائی جاتی ہیں

○ ۱۸۵۲ء ...

ناؤ بھر کر ہی، پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ، کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا
سات دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا
رُخ پہ دُولھا کے جو، گرمی سے، پسینا ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گہر بار سراسر، سہرا
یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا، آن کے دامن کے برابر، سہرا
جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیے، پھولوں کا بھی ایک مُقرّر، سہرا
جب کہ اپنے میں سماویں نہ، خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر، سہرا؟
رُخِ روشن کی دمک، گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلاوے فروغِ مہ و اختر سہرا؟
تار ریشم کا نہیں، ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائے گا تابِ گراں باریِ گوہر، سہرا؟

○ ... ۱۸۵۲ء

ہم سخن فہم ہیں، غالبؔ کے طرفدار نہیں
دیکھیں، اس سہرے سے کہدے کوئی بڑھ کر سہرا

قطعہ

م

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی — اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے
سو پشت سے، ہے پیشۂ آبا سپہ گری — کچھ شاعری، ذریعۂ عزت نہیں مجھے
آزادہ رَو ہوں، اور مرا مسلک ہے صلحِ کُل — ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں؟ — مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
استادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال — یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے
جامِ جہاں نما ہے، شہنشاہ کا ضمیر — سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
میں کون اور ریختہ؟ ہاں اس سے مدّعا — جُز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا زِرہِ امتثالِ امر — دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات — مقصود اُس سے قطعِ محبّت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو، تو روسیاہ — سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے
قسمت بُری سہی، پہ طبیعت بُری نہیں — ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول میں، غالبؔ، خدا گواہ — کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے[1]

---

[1] جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے، یہ قطعہ (معذرت نامہ) شہزادہ جواں بخت کے سہرے کے مقطع کی وضاحت میں کہا گیا تھا، اس لیے اسے سہرے کے فوراً بعد درج کیا گیا ہے۔ قطعہ دہلی اردو اخبار جلد ۱۴ نمبر ۱۳ مورخہ ۲۸ مارچ ۱۸۵۲ء میں شائع ہوا تھا

○ ... ۱۸۵۲ء

سہرا

چرخ تک دھوم ہے، کس دھوم سے آیا سہرا! — چاند کا دائرہ لے، زہرہ نے گایا سہرا[1]
جسے کہتے ہیں خوشی، اُس نے بلائیں لے کر — کبھی چوما، کبھی آنکھوں سے لگایا سہرا
رشک سے لڑتی ہیں آپس میں اُلجھ کر لڑیاں — باندھنے کو جو ترے سر پہ، اُٹھایا سہرا
صاف آتی ہیں نظر آبِ گُہر کی لہریں — جنبشِ بادِ سحر نے جو ہلایا سہرا

غزلیات

○ ... ۱۸۵۲ء (تج)

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کُھلا م — رکھیو، یارب، یہ درِ گنجینۂ گوہر کُھلا
شب ہوئی، پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کُھلا م — اس تکلف سے کہ گویا بتکدے کا در کُھلا
گرچہ ہوں دیوانہ، پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب م — آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کُھلا
گو نہ سمجھوں اُس کی باتیں، گو نہ پاؤں اُس کا بھید م — پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کُھلا
ہے خیالِ حُسن میں حسنِ عمل کا سا خیال م — خلد کا اک در ہے، میری گور کے اندر کُھلا

---

[1] یہ اس سہرے کے اشعار ہیں جو میاں غلام نظام الدین ابن میاں غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب کی شادی کے موقع پر کہے گئے تھے۔ روایت کے مطابق یہ سہرا شہزادہ جواں بخت (فروری۔ مارچ ۱۸۵۲ء) کے سہرے کے بعد کہا گیا ہے۔ کیونکہ راوی کا کہنا ہے کہ یہ اول الذکر سہرے سے بہتر ہے۔ تفصیل کے لیے ناصر نذیر فراق کی 'لال قلعہ کی ایک جھلک، بار سوئم، ص (۳۶) 'رسومِ دہلی، ص ۱۱۷ (طبع رام پور۔ ۱۹۶۵ء) از سیّد احمد دہلوی ملاحظہ کیجیے

○ ... ۱۸۵۲ء (قج)

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں م زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا
در پہ رہنے کو کہا، اور کہہ کے کیسا پھر گیا! م جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا
کیوں اندھیری ہے شبِ غم؟ ہے بلاؤں کا نزول م آج اُدھر ہی کو رہے گا، دیدۂ اختر کھلا
کیا رہوں غربت میں خوش، جب ہو حوادث کا یہ حال م نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا
اُس کی اُمّت میں ہوں میں، میرے رہیں کیوں کام بند؟ م واسطے جس شہ کے، غالبؔ، گنبدِ بے در کھلا

ہے بس کہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور م کرتے ہیں محبّت، تو گزرتا ہے گماں اور
یارب، وہ نہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے مری بات م دے اور دل اُن کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور
ابرو سے ہے کیا، اس نگہِ ناز کو پیوند؟ م ہے تیر مقرّر، مگر اس کی ہے کماں اور
تم شہر میں ہو، تو ہمیں کیا غم؟ جب اُٹھیں گے م لے آئیں گے بازار سے، جا کر دل و جاں اور
ہر چند سُبک دست ہوئے بُت شکنی میں م ہم ہیں، تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور
ہے خونِ جگر جوش میں، دل کھول کے روتا م ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور
مرتا ہوں اس آواز پہ، ہر چند سر اُڑ جائے م جلّاد کو، لیکن، وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"
لوگوں کو ہے خُورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا م ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور
لیتا، نہ اگر دل تمہیں دیتا، کوئی دم چین م کرتا، جو نہ مرتا، کوئی دن آہ و فغاں اور
پاتے نہیں جب راہ، تو چڑھ جاتے ہیں نالے م رُکتی ہے مری طبع، تو ہوتی ہے رواں اور
ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے م کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

○ ... ۱۸۵۲ء (قج)

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور م تنہا گئے کیوں؟ اب ہو تنہا کوئی دن اور
مٹ جائے گا سر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا م ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور
آئے ہو کل، اور آج ہی کہتے ہو کہ "جاؤں؟" م مانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو: "قیامت کو ملیں گے" م کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
ہاں، اے فلکِ پیر، جواں تھا ابھی عارف[1] م کیا تیرا بگڑتا، جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم ماہِ شبِ چار دہم تھے، مرے گھر کے م پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور
تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے؟ م کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
مجھ سے تمہیں نفرت سہی، نیّر سے لڑائی م بچّوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور
گزری نہ بہر حال، یہ مدّت خوش و ناخوش م کرنا تھا، جواں مرگ، گزارا کوئی دن اور
ناداں ہو جو کہتے ہو کہ "کیوں جیتے ہیں غالبؔ؟" م قسمت میں ہے مرنے کی تمنّا کوئی دن اور

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا م
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے م
تیرا پتا نہ پائیں، تو ناچار کیا کریں
کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم؟ م
ہو غم ہی جاں گداز، تو غمخوار کیا کریں

---

[1] مرزا زین العابدین خاں عارف اپریل ۱۸۵۲ء میں فوت ہوئے تھے۔ یہ غزل اُنھی کا مرثیہ ہے

○ ... ۱۸۵۲ء

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں م خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

یاد تھیں ہم کو بھی، رنگا رنگ بزم آرائیاں م لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

تھیں بنات النعشِ گردوں دن کو پردے میں نہاں م شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہوگئیں؟

قید میں یعقوب نے لی، گو نہ یوسف کی خبر م لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زنانِ مصر سے م ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں

جوے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق م میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام م قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں م تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا م بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہوگئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار؟ م جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہوگئیں

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے م میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہوگئیں

واں گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب م یاد تھیں جتنی دعائیں، صرفِ درباں ہوگئیں

جانفزا ہے بادہ، جس کے ہاتھ میں جام آگیا م سب لکیریں ہاتھ کی، گویا، رگِ جاں ہوگئیں

ہم موحّد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم م ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں، تو مٹ جاتا ہے رنج م مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں م دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

۱؎ یہ غزل دہلی اردو اخبار جلد ۱۴ نمبر ۳۲ مورخہ ۲۸ اگست ۱۸۵۲ء میں چھپی تھی

○ ... ۱۸۵۲ء (قطع)

حضورِ شاہ میں، اہلِ سخن کی آزمایش ہے م
چمن میں، خوشنوایانِ چمن کی آزمایش ہے

قدو گیسو میں، قیس و کوہکن کی آزمایش ہے م
جہاں ہم ہیں، وہاں دار و رسن کی آزمایش ہے

کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں، آخر م
ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمایش ہے

نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی؟ م
اسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمایش ہے

وہ آیا بزم میں، دیکھو، نہ کہیو پھر کہ غافل تھے م
شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمایش ہے

رہے دل ہی میں تیر، اچھا جگر کے پار ہو، بہتر م
غرض شستِ بتِ ناوک فگن کی آزمایش ہے

نہیں کچھ سبحہ و زنّار کے پھندے میں، گیرائی م
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمایش ہے

پڑا رہ، اے دلِ وابستہ، بیتابی سے کیا حاصل؟ م
مگر پھر تابِ زلفِ پرشکن کی آزمایش ہے

○ ...۱۸۵۲ء (قج)

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم، تب دیکھیے کیا ہو م
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمایش ہے

وہ آویں گے مرے گھر، وعدہ کیسا، دیکھنا غالبؔ م
نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمایش ہے

غم کھانے میں بودا، دلِ ناکام، بہت ہے م
یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام، بہت ہے

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے، ورنہ م
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

نے تیر کماں میں ہے، نہ صیّاد کمیں میں م
گوشے میں قفس کے، مجھے آرام بہت ہے

کیا زہد کو مانوں؟ کہ نہ ہو گرچہ ریائی م
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں؟ م
پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے

زمزم ہی پہ چھوڑو، مجھے کیا طوفِ حرم سے؟ م
آلودہ بہ مے جامۂ احرام، بہت ہے

○ ...۱۸۵۲ء (قج)

ہے قہر، گر اب بھی نہ بنے بات، کہ اُن کو م
انکار نہیں، اور مجھے اِبرام بہت ہے

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں، اے مرگ م
رہنے دے مجھے یاں، کہ ابھی کام بہت ہے

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے؟ م
شاعر تو وہ اچھا ہے، پہ بدنام بہت ہے

○ ...۱۸۵۲ء

نکتہ[۱] چیں ہے، غمِ دل اُس کو سُنائے نہ بنے م
کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے؟

میں بُلاتا تو ہوں اُس کو، مگر، اے جذبۂ دل! م
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بِن آئے نہ بنے

کھیل سمجھا ہے، کہیں چھوڑ نہ دے، بھول نہ جائے م
کاش! یوں بھی ہو کہ بِن میرے ستائے نہ بنے

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر م
کوئی پوچھے کہ "یہ کیا ہے؟" تو چھپائے نہ بنے

۱۔ خط بنام حقیر ۸ جنوری ۱۸۵۳ء (دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی، اشاعت دوم میں ۸ جون سہواً لکھا گیا ہے) میں اس غزل کا ذکر ہے۔ اس لیے غزل ۸ جنوری ۱۸۵۳ء سے کچھ پہلے یعنی اواخرِ ۱۸۵۲ء میں کہی گئی ہوگی۔ غزل پہلی بار اُردوئے معلّٰی (؟) میں درج ہوئی ہے

○ ... ۱۸۵۲ء

اس نزاکت کا بُرا ہو! وہ بھلے ہیں، تو کیا؟ م
ہاتھ آویں، تو اُنھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے؟ م
پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ بِن آئے نہ رہے م
تم کو چاہوں؟ کہ نہ آؤ، تو بُلائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے م
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش، غالبؔ م
کہ لگائے نہ لگے، اور بُجھائے نہ بنے

○ ... ۱۸۵۲ء (ق) رُباعیات

۱

حق شہ کی بقا سے، خلق کو شاد کرے — تا شاہ، شیوعِ دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں، گانٹھ م — ہے صِفر کہ افزایشِ اعداد کرے

۲

اس رشتے میں لاکھ تار ہوں، بلکہ سوا! — اتنے ہی برس شمار ہوں، بلکہ سوا!
ہر سینکڑے کو ایک گِرہ فرض کریں م — ایسی گِرہیں ہزار ہوں، بلکہ سوا!

۱۸۵۳ء تا ۱۸۵۶ء

مُتفرِق

نسخۂ رام پور (ثانی / جدید) ۱۸۵۵ء

قادر نامہ (طبع اوّل) ۱۸۵۶ء